فکر و نظر..... اسلام آباد جلد: ۴۶ شمارہ: ۱،۲

ڈاکٹر سیّد ابوالخیر کشفی

یادیں

(اپنے بیٹے عاکف کے ساتھ باتیں)

ایاز محمود

عاکف تمھارا مطالعۂ نثر بہت وسیع ہے مگر تم نے شاعری کتنی پڑھی ہے، یہ میں نہیں جانتا۔ طبیعیاتی اور سماجی علوم کا مطالعہ علم و فضل میں اضافے اور پیشہ وارانہ مہارت کے حصول کے لیے کیا جاتا ہے، لیکن ادب کا مطالعہ ہمیں مسرت فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ ہماری ذہنی صلاحیتوں کو جلا دیتا اور روح کو سرشار کرتا ہے اور یوں اس کا مُنتہا دراصل یہ ہے کہ انسان خود شناسی حاصل کرے۔

میرے خیال میں مذہب کے بعد شاعری ہماری شخصیت پر بھر پور انداز سے اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ تم ٹی ایس ایلیٹ کو پڑھو، خاص طو رپر اس کی شاعری۔ کل ہی رات کی بات ہے کہ میں مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اپنے ذاتی مستقبل کے بارے میں نہیں بلکہ یہ کہ مستقبل آخر ہے کیا؟ میں نے تم سے مستقبلیات پر کوئی کتاب مانگی تھی۔ کتاب نہ ملی تو بالآخر Penguin Dictionary of Quotations کو کھولا تو ایلیٹ کے ان الفاظ نے مجھے روشنی دکھائی:

Time present and time past

Are both present in time future

And time future is contained in time past

حقیقت سے آنکھیں چُرانے کا رویہ غالبًا انسانی فطرت میں شامل ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ تمھیں یاد ہوگا، تم ابھی بچے ہی تھے کہ میں نے یہ سوال تمھارے سامنے رکھا تھا اور تب ہی سے ہم اس مسئلے پر سوچتے آئے ہیں۔ کوئی تشفی بخش جواب نہ مل سکا۔ اب دیکھو.....!ایلیٹ کیا کہتا ہے:

Humankind

Can not bear very much reality

مجھے اعتراف ہے کہ میں اپنی صلاحیتوں کو بھر پور طریقے سے استعمال نہ کرسکا۔ اختر حسین رائے پوری کی ایک بات یاد آرہی ہے۔ ایک بار انھوں نے اختر انصاری اکبر آبادی کی ایک کتاب کی بے حد تعریف لکھی۔ وہ کتاب کچھ یوں ہی سی تھی۔ اس تعریف کا سبب پوچھا تو فرمایا:

''دیکھو!اللہ تعالیٰ نے انھیں واجبی ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ دنیا میں بھیجا۔ اس کے باوجود وہ مسلسل ادب کی خدمت میں لگے رہے۔ یومِ حساب اللہ تعالیٰ کہے گا میں نے اپنے اس بندے کو نسبتاً کم صلاحیتیں دیں، مگر اس نے ان کا کیسا بھر پور استعمال کیا''۔ پھر فرمایا، ''اب تم اپنی طرف دیکھو۔ خدا نے تمھیں ادبی ذوق دیا، اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے مواقع دیے۔ ایک دل نشیں طرزِ تحریر دیا۔ خدا تم سے پوچھے گا کہ میں نے تمھیں کیسی صلاحیتیں دیں اور تم نے ان کا کیا استعمال کیا، تو کیا جواب دوگے؟''

میں نے خفیف ہوکر موضوع بدل دیا، لیکن حقیقتاً میرا جواب ایلیٹ کی ان لائنوں میں موجود ہے جو میں نے ابھی تمھیں سنائیں۔

میں شاعری کے مطالعے کی بات کررہا تھا.....خصوصاً ایلیٹ کی شاعری کے مطالعے کی۔ شاعری کا ایک کمال یہ ہے کہ اس کا مفہوم قراء ت متن کے ساتھ متعین ہوتا رہتا ہے۔ قاری کی شعری تفہیم اور شعر کی اثر پذیری منشائے مصنف سے مختلف بھی ہوسکتی ہے۔ اسی وجہ سے شاعری میں خصوصاً اور دیگر اصنافِ ادب میں بالعموم، آفاقی اعتبار بننے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ بسا اوقات، جب میں نے اپنے معاصر شعراء کی تخلیقی کاوشوں کی تشریح و توجیہہ پیش کرنے کی کوشش کی تو یوں بھی ہوا کہ ان شعراء نے جن میں سے اکثر مجھ سے سینئر تھے، اعتراف کیا کہ ان کا مدّعا میرے تشریح کردہ مفہوم سے مختلف تھا۔ لیکن میری تشریح سے شعر کا ایک نیا رُخ اُن کے سامنے آیا۔ اب ایلیٹ کے ان مصرعوں کو دیکھو:

Between the idea

And the reality

Between the motion

And the act

Falls the shadow

انگریزی میری مادری زبان نہیں ہے، مگر میں ان مصرعوں میں موجود اُس تمثیل کو دیکھ سکتا ہوں جو انسانی زندگی کی تمثیل ہے۔ یہاں سائے (Shadow) سے مراد محض ایک جیتا جاگتا انسان نہیں بلکہ میں خود ہوں۔ یہ میری زندگی ہے۔ عمل پذیر، متحرک اور زوال سے آشنا ہوتی ہوئی۔ خواہش اب یہ ہے کہ اپنے تمام تر ادبی کام کو جو مختلف رسائل اور جرائد میں بکھرا ہوا ہے، یکجا کرسکوں۔ تم نے

States Man میں شائع ہونے والے میرے کالموں کو جمع کیا اور انہیں یکجا کر کے ''Sounds and Whispers'' کے نام سے کتابی صورت دی۔ ان کالموں کا مرتبہ ادبی لحاظ سے بہت بلند نہ سہی مگر ان کے ذریعے اسّی کی دہائی کے اوّلین برسوں کے ادبی ماحول کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یوں اس کام کی اہمیت ادبی بھی ہے اور تاریخی بھی۔

میں اپنے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ ادبی کام کو مجتمع کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے تجرباتِ زندگی بھی قلم بند کرنا چاہتا ہوں۔ خواہش ہے کہ اس کام کو اپنے بچوں کو تحفتاً پیش کروں..... اس امید کے ساتھ کہ وہ اس کی روشنی میں خود کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ میرے بچے فقط میری اولاد ہی نہیں بلکہ آنے والی نسلیں بھی ہیں۔ انسان اگر خود فریب نہ ہو تو وہ یہ کہنے کی جسارت نہیں کرسکتا کہ وہ اپنے دور کا مرکزی کردار تھا۔ مجھے اپنی اور اپنے کام کی محدودیت کا اعتراف ہے۔ فرائض منصبی کے علاوہ میں نے جب بھی لکھا اپنی ذاتی طمانیت کے لیے لکھا۔ ایک جملہ برسوں سے میرے ساتھ ہے:

"Self expression is the only justification of life."

اب دیکھو اپنے میرؔ صاحب کیا کہتے ہیں:

ہاں فقط ریختہ کہنے ہی نہ آئے تھے ہم
چار دن یہ بھی تماشا سا دکھایا ہم نے

اپنے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے بہتر ہے کہ میں اپنے آباء و اجداد کا تذکرہ کروں۔ ہمارے دور میں اپنی جڑوں کی تلاش ایک بنیادی مسئلہ بن گئی ہے۔ ستر کی دہائی میں Alex Heley کی مہتم بالشان تصنیف Roots کے اثرات نے اس سلسلے کو مزید وسعت دی۔ اپنے تعلق سے یہ بات سوچتا ہوں تو مجھے نوجوانی کے وہ دن یاد آتے ہیں جب اندر کا جوشیلا باغی، سلسلۂ نسب کی بنیاد پر قائم افضلیت کو ماننے سے منکر تھا۔ ہاں!..... میں ایک غصیلا نوجوان تھا۔ میرا غصہ تھا کہنہ رسم و رواج کے خلاف، خاندانی وقار اور خونی سلسلوں سے وابستہ جذبۂ تفاخر میرے لیے بورژوا عظمت پرستی اور انسانی تفریق کی علامت تھا۔ یعنی ایک طرح کا ذات پات کا نظام..... ہندوستانی مسلمانوں میں یہ طرزِ احساس ہندو تہذیب کی دَین تھا۔ قیامِ پاکستان کے پچپن چھپن سال بعد بھی ذات برادری کے نظام اور اس سے پیدا ہونے والی مقامی عصبیت نے ہمیں ایک قوم نہ بننے دیا۔ حقیقت یہی ہے کہ وطنِ عزیز میں آج بھی لسانی اور مقامی سرحدوں کے پار شادی بیاہ کے رشتوں کو قائم کرنے کا رجحان نہ ہونے کے برابر ہے۔

جنوبی ایشیا کی تاریخ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالیں تو کئی اہم خاندانی سلسلے،شاہی سلسلوں کی طرح قائم ہوتے نظر آتے ہیں۔ یعنی ایسے خاندانی سلسلے جن کی علمیت اور دانش وری میں کوئی کلام نہ تھا۔ سرسیّد احمد خان، ڈاکٹر محمود اور سر راس مسعود.....یہ ہے ایک عظیم سلسلۂ دانش جو تین نسلوں پر محیط ہے۔ حال کی بڑائی غلام السّیدین، غلام الثقلین، خواجہ احمد عباس اور صالحہ عابد حسین تک پہنچی۔ میدانِ سیاست میں نمایاں مثال موتی لال، جواہرلال، اِندرا گاندھی اور راجیوگاندھی کا سلسلہ ہے۔ ہندو ذات پات کے نظام میں سماجی رتبہ اور خاندانی پیشہ نسل درنسل منتقل ہوتا رہتا ہے۔

عاکف! تمھارے پاس ہمارا شجرۂ نسب موجود ہے۔ اوائلِ شباب میں، میں نے اس کی طرف توجہ نہیں دی کہ مجھ کو معلوم تھا کہ یہ تو کتابوں میں محفوظ ہے۔ پھر پاکستان بن گیا۔ میں اپنے پیاروں سے کٹ کر یہاں چلا آیا۔ میں اکیلا ہو گیا تھا۔ اکیلے پن کے اس احساس نے سلسلۂ نسب کی اہمیت کو دل میں اُجاگر کردیا۔ مجھے تمام شجرہ زبانی یاد نہیں لیکن تم جانتے ہو کہ ہم زیدی سیّد ہیں۔ میرے خیال میں سیّد ہونا ایک بہت بڑی ذمہ داری کو نبھانے کا نام ہے۔ اسلام سے گہرا لگاؤ، کریم النفسی، انسانی ہمدردی، دیانت داری، تمام انسانوں سے بالعموم اور مسلمانوں کے ساتھ بالخصوص عمدہ برتاؤ اور اعلیٰ زمانی و روحانی مدارج ..... یہ وہ خصوصیات ہیں جن کی ایک سیّد سے توقع کی جاسکتی ہے۔

انسان کوخدائی سانچے میں ڈھالا گیا ہے، اس کے باوجود وہ کامل نہیں۔ میرے اندر بھی بہت سی کوتاہیاں ہیں، لیکن جب مڑکر پیچھے دیکھتا ہوں تو اس بات پر خود کو مطمئن پاتا ہوں کہ میں نے آج تک نہ تو کسی کے خلاف سازش کی اور نہ ہی کبھی ناانصافی اور جبر کے خلاف آواز اُٹھانے سے باز رہا۔ زندگی میں کئی مواقع پر میں اپنے حقیقی جذبات کا اظہار کرکے ہی رہا۔ شیوخ الجامعہ، وزرا حتیٰ کہ صدرِ مملکت کے منھ پر بات کہنے سے کبھی نہیں چوکا۔ یہ بے باکی کبھی بھی اپنی ذات کے حوالے سے نہیں تھی، میں جب کبھی بھی ثابت قدمی کے ساتھ ڈٹا تو دوسروں کے لیے ..... ایسے موقعوں پر بڑے طمطراق والے بہت چھوٹے نظر آئے۔ مجھے یقین ہے کہ کبھی ایسا وقت آیا تو تم بھی سیّد ہونے کے اس سنسنی خیز تجربے کو محسوس کرو گے۔ تمھیں لگے گا کہ ذمہ داری کا ایک بوجھ تھا جو تمھارے شانوں سے ہٹ گیا ہے۔

ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ ہم زیدی سیّد ہیں۔ میرے اجداد نے کب ہندوستان سے ہجرت کی، اس کا علم تو نہیں، لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ہم مغلیہ دور کے بادشاہ گر سیّدوں میں سے ہیں۔ میں اپنے اجداد کی تاریخی کردار پر نازاں نہیں، مگر تاریخ ہے کیا؟..... ایک بڑی حد تک غیر مستند دستاویز جس میں تاریخ نویس کی ذاتی پسند، ناپسند کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سیّد ہونا اور پھر بادشاہ گر ہونا کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ بادشاہ گری دراصل کیا ہے؟ تم جیسے اعلیٰ سرکاری عہدے دار کے لیے یہ سمجھنا چنداں مشکل نہ ہوگا۔

کوفہ کے شہریوں کی پکار پر حضرت امام حسینؓ نے جب قصدِ سفر کیا تو حضرت ابنِ زبیرؓ نے ان سے فیصلے پر نظرِ ثانی کی درخواست کی۔ ان کا کہنا تھا کہ اب وہ دن گزر چکے جب خانوادہ رسول ﷺ اور مسندِ اقتدار کی کامیاب یکجائی ممکن تھی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ تاریخ کا حصہ ہے۔

میں یہ بات تمھیں تاریخی حوالوں سے باور کرانا چاہتا ہوں کہ انبیا دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ جو جاہ و حشم کے ساتھ مسندِ اقتدار پر فائز ہوئے جیسے حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام اور دوسرے وہ جو عام آدمیوں کے درمیان ان ہی کی طرح رہتے بستے تھے۔ جیسے نبیِ آخرالزماں حضرت محمد ﷺ۔ آپ ﷺ کے پاس ہر طرح کا اختیار تھا۔ آپ ﷺ ریاستِ اسلامی کے پہلے سربراہ تھے، مگر آپ ﷺ کا طرزِ حیات ایک طاقت ور بادشاہ کے بجائے ایک عبد کا تھا۔ آپ ﷺ فرش پر چٹائی پر استراحت فرماتے۔ کئی کئی ہفتے گزر جاتے اور آپ ﷺ کے گھر میں چولھا نہ جلتا۔ کوئی ناواقف، اجنبی اجتماعِ رسول ﷺ میں آتا تو اس کو پوچھنا پڑتا کہ تم میں سے محمد ﷺ کون ہیں؟

میرے اجداد نے کڑا کو اپنا مسکن بنایا۔ ایک زمانے میں یہ ایک اہم شہر تھا جو علاء الدین خلجی کی حکومت کا دارالخلافہ رہا۔ آج کل یہ یوپی صوبے کا ایک غیر اہم قصبہ ہے جو الہ آباد ضلعے میں واقع دریائے گنگا کے کناروں پر آباد ہے۔ دریا کے دوسرے کنارے پر ضلع پرتاب گڑھ کا شہر مانک پور ہے۔ بسا اوقات دونوں شہروں کو ایک اکائی کے طور پر کڑا مانک پور کہا جاتا ہے۔

میرے ددھیالی سلسلے کے ایک بہت اہم فرد شاہ غلام رسول، رسول نما ہیں۔ وہ اپنے دور کے

بڑے مصلح اور روحانی پیشوا تھے۔ انیسویں صدی ہندوستانی مسلمان کے لیے بڑی اہمیت کی حامل رہی ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد مسلمانوں کے کئی گروہوں نے تعمیرِ نو کا کام شروع کردیا تھا۔ ان میں ایک طرف تو جید علمائے دین تھے جیسے مولانا قاسم نانوتوی اور شاہ امداد اللہ مہاجر مکی..... دوسری جانب روحانیت کے پیروکار صوفیۂ کرام تھے جنھوں نے افرادی اور معاشرتی سطح پر ہونے والے نقصانات کے ازالے کا بیڑا اُٹھایا۔

اس دوسرے گروہ میں شاہ غلام رسول، رسول نما اور حضرت مولانا فضلِ رحمٰن گنج مراد آبادی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ دونوں ہم عصر آپس میں دوست تھے۔ حضرت رسول نما کا مسکن کان پور، گنج مراد سے تیس میل کے فاصلے پر تھا۔ یہ دوری کچھ ایسی نہ تھی کہ دونوں بزرگوں کی باہمی ملاقاتوں میں حائل ہوسکتی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان دونوں حضرات کا طرزِ زندگی ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھا۔ مولانا فضلِ رحمٰن کی زندگی بہت سادہ تھی۔ سادہ خوراک اور سادہ لباس۔ اس کے برخلاف حضرت رسول نما نہ صرف جامہ زیب تھے بلکہ ان کے ملبوسات بہت قیمتی ہوا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ فضلِ رحمٰن کو ایک قیمتی اونی عبا ہدیتاً پیش کی گئی۔ وہ مسکرائے اور اپنے ایک مرید سے کہا، ''اسے میرے دوست کو کان پور پہنچا دو۔ یہ ان کے لیے ہے، میرے لیے نہیں۔'' بظاہر اس کروفر کے پیچھے ایک راز تھا جو ان کے قریبی متبعین سے بھی مخفی تھا۔ ایک آدھ مرتبہ استعمال کے بعد مولانا ایسے ملبوس غرباء کو ہدیہ کردیتے جو ان کے ہاں شادی بیاہ اور دیگر تقریبات میں کام آتا۔ مولانا کی اُترن ہونے کے باعث لباس کی قدر و قیمت اور بھی بڑھ جاتی۔

حضرت شاہ غلام رسول، رسول نما کے دو بیٹے تھے۔ مولانا عبدالحق اور شاہ احسان الحق۔ مولانا عبدالحق سرزمینِ حجاز ہجرت کرگئے اور اپنی بقیہ زندگی وہیں گزاری۔ انھیں مولانا عبدالحق مہاجر مکی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے بارہا مکہ مکرمہ حاضری کی سعادت نصیب کی۔ میں جب بھی مکہ جاتا، جنۃ المأویٰ میں بغرضِ فاتحہ ضروری حاضری دیتا۔ مولانا کا خیال نہ آتا۔ ۱۹۹۲ء کے رمضان میں جب میں اور تم شرفِ حاضری سے فیض یاب ہوئے تو مجھے پہلی بار مولانا یاد آئے۔ دوسرے بیٹے شاہ احسان الحق کان پور میں اپنے والد کے مدفن کے برابر آسودۂ خاک ہیں۔ تم نے بھی یہ قبر دیکھی ہوگی۔ حضرت کان پور اور اس کے نواحی علاقوں میں ''دادامیاں'' کے نام سے معروف ہیں۔ یہ لگ بھگ ایک صدی کا قصہ ہے۔ لوگ انھیں اپنا روحانی بزرگ مانتے ہیں۔ ایسے ہی مسلمان صوفیہ کے لیے خوشونت سنگھ نے ''سرپرست ولی'' (Guardian Saint) کی اصطلاح وضع کی ہے۔

میری دادی ''بڑو بی بی'' شاہ احسان الحق کی صاحب زادی تھیں۔ ان کا حقیقی نام حمیرا تھا۔ یہ میری داستانِ حیات کا ایک لازمی کردار ہیں سو ان کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔ ان کی شادی شاہ محمد اکبر سے ہوئی جو کڑا مانک پور کے رہنے والے تھے مگر شادی کے بعد اپنے سسرالی شہر کان پور میں بس گئے۔ شاہ محمد اکبر بھی ایک بزرگ صوفی شخصیت تھے۔ تم نے بڑا پھاٹک دیکھا ہے جہاں سے حضرت رسول نما کی مسجد اور ہمارے آبائی گھروں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ وہ چالیس برس تک اس پھاٹک سے باہر نہیں نکلے۔ عمر کے آخری حصے میں وہ مکمل طور پر مفلوج ہوچکے تھے۔ ان کا انتقال میری پیدائش سے پہلے ہوا۔ یہ ۱۹۲۹ء یا ۱۹۳۰ء کی بات ہے۔ میرے ایک عزیز محمد زبیر فاروقی نے جو ابھی ماشاء اللہ بقیدِ حیات ہیں، مولانا کو دیکھا ہے۔ میں نے ۱۹۸۵ء میں داڑھی رکھی تو انھیں میری شکل میں دادا جان کی شبیہہ نظر آئی۔ ہاں! جسامت کا فرق تھا۔ میرے مقابلے میں وہ طویل القامت اور مضبوط کاٹھی کے مالک تھے۔

بڑو بی بی کی چار بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ ان سب کے اصل نام یاد نہیں۔ بڑی بیٹی کو بی بی کہتے تھے۔ دوسری تھیں اچھی پھوا، تیسری چنّی اور سب سے چھوٹی ننھی ..... تایا ابوطاہر بہن بھائیوں میں بڑے تھے۔ ان کی تاریخ پیدائش ۱۸۹۰ء اور ۱۸۹۵ء کے درمیان ہے۔ والدِ محترم پانچویں نمبر پر تھے۔ ان سے چھوٹی صرف ننھی تھیں۔ والد کا نام ابو محمد رکھا گیا مگر وہ معروف ہوئے ''عموجان'' کی عرفیت سے۔ بیسویں صدی کی دوسری نصف دہائی کے لگ بھگ انھوں نے شاعری کا آغاز کیا اور ثاقبؔ کان پوری کے تخلص سے شہرت پائی۔

میرے والد کی تاریخِ پیدائش میں کچھ تسامح ہے۔ تمام تر سرکاری دستاویزات کے مطابق یہ ۱۹۰۴ء ہے لیکن اپنے آخری دنوں میں خود ان کی زبانی پتا چلا کہ وہ ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔ بی بی کے بڑے بیٹے سیّد علی زیدی ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے بقول میرے والد ان سے فقط دو سال بڑے تھے۔ ایک اور بات جو میں سوچتا ہوں وہ یہ ہے کہ عمو جان کی شادی ۱۹۲۷ء میں ہوئی۔ اس کا اندراج اُن کی ڈائری میں موجود ہے، جو اب تمھارے پاس ہے۔ ۱۹۰۰ء کے مطابق وہ شادی کے وقت ستائیس برس کے ہوئے جو اس زمانے کے لحاظ سے خاصی زیادہ عمر ہونی چاہیے۔ یوں مجھے ۱۹۰۴ء ہی زیادہ معتبر لگتا ہے۔ عموجان نے اپنا سنِ پیدائش مجھے خود بتایا تھا، مگر اس وقت وہ بہت بوڑھے ہوچکے تھے اور ان کی یادداشت جواب دیتی جارہی تھی۔

والدِ محترم نے ابتدائی تعلیم مدرسے میں حاصل کی۔ یہ مدرسہ ہمارے گھر سے متصل حضرت

صاحب کی مسجد میں واقع تھا۔ آج کان پور جانے والے کو اس کی اہمیت کا اندازہ شاید نہ ہوسکے، لیکن میرے بچپن کا کان پور ایک اہم ترین شہر تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے دوران اسے مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ بعد ازاں جب شکستہ حال مسلمانوں نے خود کو مجتمع کرنا شروع کیا تو کان پور کے فیضِ عام اسکول کا قیام احیائے تعلیم کی جانب پہلا قدم تھا۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ جیسے عظیم دینی ادارے کے قیام سے متعلق فیصلے بھی اسی شہر میں ہوئے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے مدرّسی کا آغاز جامع العلم پٹکاپور سے کیا جو اسی شہر میں ہے۔ اس کے علاوہ منشی رحمت اللہ رعد تھے جنھوں نے کان پور میں ''نامی'' چھاپے خانے کی بنیاد ڈالی ۔ لیتھوپریس کے اس دور میں نامی پریس کے معیار کو سامنے رکھیے تو معلوم ہوگا کہ وہ کسی اعتبار سے کم نہ تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آج کل کے ترقی یافتہ دور میں بھی کم ہی کتابیں اس نفاست اور خوش سلیقگی کے ساتھ چھپتی ہیں۔ منشی رحمت اللہ کو مسدسِ رعد حالی کی اوّلین طباعت کا اعزاز حاصل ہے۔ اس اشاعت میں مسلمانوں کی ایجادات سے متعلق خاکے دیے گئے تھے جو اپنی دیدہ زیبی میں حیرت انگیز طور پر بے مثال معلوم ہوتے ہیں۔

مولانا آزاد سبحانی مدرسۂ الٰہیات میں تعلیم دیتے تھے۔ یہ بیسویں صدی کے اوائل کے بات ہے۔ میرے والد نے مسجد مدرسہ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد اسی ادارے میں داخلہ لیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ مولانا آزاد اس کالج کے بانی تھے یا نہیں لیکن والدِ محترم کے داخلے کے وقت وہ یقینی طور پر اس کے پرنسپل تھے۔

عموجان کے ہم جماعتوں میں ڈاکٹر طاہر فاروقی تھے جو بعد میں سینٹ جونز کالج آگرہ میں اردو کے لیکچرر ہوئے۔ تقسیم کے بعد وہ ڈھاکا چلے گئے اور جامعہ ڈھاکا میں پڑھانے لگے۔ بعد میں وہ جامعہ پشاور چلے آئے، پروفیسر ہوئے اور صدرِ شعبۂ اردو کے عہدے تک پہنچے۔ ڈاکٹر فاروقی نے جامعہ انقرہ میں بھی اُردو پڑھائی۔ انھوں نے متعدد ادبی اور درسی کتابیں مرتب کیں۔ کچھ عرصہ پہلے اُن کا انتقال ہوا تو شعبۂ اردو اور جامعہ پشاور کے مجلّے ''خیابان'' کا ڈاکٹر طاہر یادگاری شمارہ شائع کیا گیا۔

ایک اور ہم جماعت ملّا رموزی تھے جو بعد میں مزاح نگار کی حیثیت سے ممتاز ہوئے۔ ملارموزی کا وصفِ خاص ان کی گلابی اُردو تھی۔ وہ قدیم اسلوب میں اردو لکھتے اور اس سے اپنی تحریر میں مزاح پیدا کرتے۔

مولانا آزادسبحانی ایک اچھے منطق دان تھے لیکن اُن کو شہرت ایک عظیم مذہبی رہنما کے حیثیت

سے ملی۔ وہ اچھے شاعر بھی تھے۔ تاریخِ ہندوپاک کے مطالعے کے دوران تم نے ''مچھلی بازار مسجد'' کاواقعہ ضرور پڑھا ہوگا۔ یہ واقعہ خاص طور پر بیسویں صدی کے دوران مسلمانانِ برِصغیر کی تاریخ میں ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے پس منظر میں مچھلی بازار مسجد کا شہید کیا جانا ہے جس کا محرک انگریز سرکار تھی۔ یہ کام ہندوؤں کی خوشنودی کے لیے کیا گیا تھا جن کا مندر مسجد کے بالکل سامنے واقع تھا۔ مندر سڑک کے بیچوں بیچ تھا لہٰذا سڑک کو دو رویہ بنانا پڑا۔ سڑک کی توسیع کی آڑ میں مسجد کا ایک حصہ منہدم کردیا گیا۔ اس پر مسلمانوں نے احتجاج کیا۔ گولیاں چلیں اور کئی لوگ شہید ہوگئے۔ احتجاجی تحریک کے روحِ رواں مولانا آزاد سبحانی تھے۔ انھوں نے اس واقعے کو ماضی کے سیاق و سباق اور مستقبل کے تناظر میں دیکھا۔ ملک کے طول و عرض میں آگ بھڑک اُٹھی۔ علامہ اقبال بھی بحیثیتِ وکیل کان پور تشریف لائے۔ یہ اُن کا یہاں کا پہلا اور آخری دورہ تھا۔ مولانا شبلی نعمانی نے اپنی نظموں کے ذریعے اس المیے کو قلم بند کیا:

یہ بچے ہیں انھیں تو جلد سوجانے کی عادت ہے

کان پور نہ آسکنے کے دُکھ کو اُنھوں نے یوں محسوس کیا

کہ شبلی بمبئی میں رہ کے محرومِ شہادت ہے

واقعے کے ردِعمل کے طور پر بہت سے علماء گرفتار کیے گئے تو شبلی پکار اُٹھے:

پہنائی جارہی ہیں عالمانِ دیں کو زنجیریں

یہ زیور سیّدِ سجادِ عالی کی وراثت ہے

ہا ں تو مولانا آزاد سبحانی کی بات کر رہے تھے۔ میں تمھیں بتاتا ہوں کہ وہ کیسی زندگی بسر کرتے تھے۔ یوں سمجھ لو کہ اُن کی سادہ روش دیکھ کر اصحابِ رسول ﷺ کی یاد تازہ ہوجاتی تھی۔ ان کا لباس فقط ایک لنگی اور کرتے پر مشتمل تھا۔ ہاتھ میں معمولی لکڑی کی لاٹھی رکھتے۔

مولانا آزاد سبحانی کے بارے میں تفصیلی گفتگو کرنے کو جی چاہتا ہے۔ کتنے دُکھ کی بات ہے کہ ہم ان زعماء کو فراموش کرتے جارہے ہیں جن کی مساعی سے قیامِ پاکستان کا عمل ممکن ہوا۔ یہ اجتماعی نسیان کی سی کیفیت ہے۔ غالباً ایسا جان بوجھ کر کیا جارہا ہے۔ ہمارے آج کے قائدین نہیں چاہتے کہ ان کا موازنہ عہدِ رفتہ کے ان عظیم افراد سے کیا جائے جو کردار اور صلاحیت کے اعتبار سے واقعی قد آور تھے۔ ہماری یہ واقفیت دورِ حاضر کے بونوں کا قد اور بھی چھوٹا کردے گی۔

اور ہاں عاکف.....! تمھاری والدہ نے مولانا سے تعلیم حاصل کی اور وہ یوں کہ مولانا اُنھیں تعلیم

دینے کے لیے بسّی (سرھند) تشریف لے گئے۔ اس وقت وہ چھ یا سات برس کی ہوں گی۔ تمھارے نانا حاجی عبدالغفور کا مولانا سے یارانہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے یہ ذمہ داری قبول کی۔ نتیجہ یہ تھا کہ طاہرہ دس ہی برس کی عمر میں فارسی پر عبور حاصل کرچکی تھی۔ یہ بات بظاہر ناقابلِ یقین معلوم ہوتی ہے مگر خال خال ایسا بھی ہوتا ہے کہ قدرت کچھ افراد کو غیر معمولی ذہنی صلاحیتیں بخش دیتی ہے۔ تمھاری والدہ بھی ان غیر معمولی لوگوں میں سے تھیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب میں نے پہلی بار اُن کو دیکھا۔ سن تھا غالباً ۱۹۴۴ء..... میں اُس وقت نویں جماعت کا طالبِ علم تھا۔

مولانا سبحانی ایک خانہ بدوش عالم تھے۔ وہ اپنے تحریکی پیغام کو جگہ جگہ لے کر جاتے۔ ان کی تحریک تھی ''تحریکِ ربانی''..... جس کا بنیادی پیغام تھا، ''معاشی انصاف سب کے لیے'' .....وہ سمجھتے تھے کہ ہر انسان کو وہ تمام تر سہولیات فراہم ہونی چاہئیں جو اس کو ذہنی جِلا دینے میں معاون ثابت ہوں۔ ربوبیت کے لغوی معنیٰ کسی چیز کو ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے تک پہنچاتے رہنے کے ہیں۔ اس وقت تک جب تک وہ اپنے تمام تر امکانات کو نہ پالے، مثلاً ماں دودھ کے اجزائے ترکیبی شیر خوار کی جسمانی ضروریات کے مطابق تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور جب بات نسلِ انسانی کی ہو تو معاملہ صرف جسمانی خوراک کی فراہمی تک نہیں رہتا بلکہ ذہن اور روح کو مستقل تقویت اور استحکام کی ضرورت رہتی ہے مولانا کی مساعی کے پیچھے یہی سوچ کارفرما تھی۔

مولانا اور ان کی تحریک کو ناپسند کرنے والے بھی موجود تھے، مثلاً نظام حیدر آباد، نظام بہادر یار جنگ سے اتنا آزردہ ہوا کہ ان کی نوابی کا خطاب بھی واپس لے لیا گیا۔ اس کی ایک وجہ تو مولانا کی حیدرآباد میں نظریاتی و تبلیغی سرگرمیاں تھیں جن کا ہدف خاص سرمایہ داری نظام تھا۔ ان دنوں مولانا بہادر یار جنگ کے مہمان تھے۔ علاوہ ازیں بہادر یار جنگ آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ کی سیاست میں سرگرم تھے اور نظام کسی بھی قیمت پر انگریز سرکار کی حمایت سے دست بردار ہونے پر تیار نہ تھا۔

کم لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ مولانا آزاد سبحانی جمعیتِ علمائے اسلام کے بانی تھے۔ یہ مذہبی و سیاسی تنظیم جمعیت العلمائے ہند کے پروپیگنڈے کا جواب دینے کے لیے وجود میں آئی تھی۔ جمعیت العمائے ہند دراصل کانگریس کی الحاقی تنظیم تھی۔ اس کے رہنما دو قومی نظریے کے مخالف تھے اور انھوں نے نہایت شد و مد کے ساتھ قیامِ پاکستان کی مخالفت کی۔ آج بھی بہت سے لوگوں کے خیال میں تمام مذہبی رہنما مسلم لیگ اور پاکستان کے مخالف تھے۔ اس سوچ کو پروان چڑھانے میں دیگر سیاسی جماعتوں کا بھی ہاتھ ہے جو اپنے جماعتی عزائم کے تحت یہ بات دُہراتی رہتی ہیں۔ یہ صریحاً تاریخی غلط

بیانی ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا ظفر احمد عثمانی کی ساری توانائیاں قیامِ پاکستان کے لیے وقف تھیں۔ سیّد سلیمان ندوی جو اپنے دور کے عظیم تاریخ دان اور محقق تھے، ہمیشہ مسلم لیگ کے حامی رہے۔ اسی حوالے سے ایک اہم ترین نام عظیم دیوبندی بزرگ مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ہے۔ مولانا مسلم لیگ کے خیر خواہ تھے۔ دوسری جانب مولانا حسین احمد مدنی اور مفتی کفایت اللہ کانگریس کے حامی تھے۔ مسلمانوں کی تحریک قیامِ پاکستان پر منتج ہونے والی تھی۔ عوامی جذبات بھپرے ہوئے تھے۔ کانگریسی رہنما مولانا ابوالکلام آزاد کو کلکتہ میں نمازِ عید کی امامت سے روک دیا گیا اور یہ اعزاز مولانا آزاد سبحانی کے حصے میں آیا۔

مولانا سبحانی ایک شعلہ بیان مقرر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بلند پایہ ادیب بھی تھے۔ یہ دو اوصاف مشکل ہی سے یکجا ہوتے ہیں۔ مولانا نے ''تفسیرِ ربانی'' کے نام سے قرآن کی تفسیر تحریر کی۔ یہ کام وسائل طلب تھا اور مولانا کی خودداری، دوسروں کے سامنے دستِ طلب دراز کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ اس کا حل انھوں نے یوں نکالا کہ ایک وقت میں تیس چالیس صفحات پر مشتمل تحریر شائع کردیتے، لہٰذا یہ تفسیر جگہ جگہ بکھری ہوئی ہے جس کا مجتمع ہوکر شائع ہونا ایک امرِ محال نظر آتا ہے۔

مولانا کا طرزِ فکر فلسفیانہ تھا۔ ان کی دروں بینی ان کے سفرنامہ امریکا سے آشکار ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے اس سفرنامے کی جلدِ اوّل ہی شائع ہوسکی۔ اس میں مولانا نے سفر کے بہت سے مثبت پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ سفر کے دوران انسان پر اپنا آپ منکشف ہوتا ہے۔ اس کتاب میں مولانا نے وضاحت کی ہے کہ دورے کے لیے، جس کا مقصد پاکستان کے پیغام کو مغرب میں پھیلانا تھا، انھوں نے مسلم لیگ سے کسی بھی قسم کی مالی مدد قبول نہیں کی۔ یہ ۱۹۴۶ء کی بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا کی رائے مسلم لیگ کے رہنماؤں کے بارے میں اچھی نہ تھی۔ اس میں واحد استثنیٰ قائدِاعظم محمد علی جناح کی شخصیت تھی۔ وہ اکثر یہ بات کہتے کہ وہ مسلم لیگ کے ''دو آنے'' کے بھی ممبر نہیں، لیکن قیامِ پاکستان ان کے تیقن کا حصہ تھا۔ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی تحریر کردہ ایک کتاب شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کا موضوع مولانا آزاد سبحانی ہیں۔ مولانا کے اس تذکرے کو یہ کہہ کر ختم کرتا ہوں کہ میں نے کبھی بھی ان سے باضابطہ تحصیلِ علم نہیں کیا۔ وہ میرے، میرے والد اور طاہرہ کے درمیان ایک پُل تھے۔ وہ جب بھی کان پور آتے تو ہمارے ہاں ہی قیام کرتے۔ اس دوران اُن کی گفتگو سے مستفیض ہونے کے مواقع ملتے اور یوں میں نے اُن سے بہت کچھ سیکھا۔

عموجان کے ایک اور استاد تھے، مولانا محمد حسین محوی، وہ ہمارے گھر آتے تو اُن سے ملاقاتیں ہوتیں۔ بعد میں وہ جامعہ مدراس میں پروفیسر کے عہدے تک پہنچے۔ وہ شاعر اور تنقید نگار تھے مگر ایک انسان کی حیثیت سے مجھے کبھی متاثر نہ کرپائے۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ وہ ایک خاموش طبع انسان تھے۔ میری نو عمری کے دن تھے۔ میں اُن سے کچھ سیکھنا چاہتا تھا مگراُن کی کم گوئی مانع آجاتی۔

اچھا.....!تو عموجان کی کچھ اور باتیں کرلی جائیں۔ تم نے ان کو کان پور میں دیکھا تو وہ ان کی زندگی کا آخری دور تھا۔ یہ ستر کی دہائی کی بات ہے۔ ان دنوں ان کا گھر سے نکلنا اور دوستوں سے میل ملاقات کا سلسلہ تقریباً ختم ہوچلا تھا۔ تم نے اپنا آبائی گھر دیکھا ہے، عرصہ دراز سے لے کر اب تک اس کے دوحصے ہیں۔ زنانہ اور مردانہ خانہ۔ تم نے ان عمارتوں اور ان کے مکینوں میں خستگی کے آثار بھی دیکھے ہوں گے۔ عموجان کے آخری دن تھے۔ میں اُنھیں جب بھی دیکھتا تو ان کے ہاتھ پیروں میں پارکنسن کے زیر اثر رعشہ طاری ہوتا اور مجھے رنگون میں اپنے آخری ایام گزارتے بہادر شاہ ظفر کی یاد آتی۔ گزرتا وقت ایک انجمن آرا شخص کو کیسا محدود کردیتا ہے۔

میں بچپن میں مردان خانے میں سوتا تھا۔ عمو جان کی چارپائی کے برابر..... نیند آنے تک وہ مجھے سیاروں اور ستاروں کے محلِ وقوع اور چال کے بارے میں بتاتے۔ کہکشانی جھرمٹ کی طرف اشارہ ہوتا اور کہتے کہ یہ محمد ﷺ کا راستہ ہے جس سے ہوکر وہ سفرِ معراج پر گئے ۔ اس قسم کے علامتی حوالے دنیا بھر کے ادب اور ثقافتوں میں بکھرے پڑے ہیں۔

عمو جان نے تمام عمر کوئی پیشہ اختیار نہیں کیا۔ آبائی زرعی زمینوں سے ٹھیک ٹھاک آمدنی ہو جایا کرتی تھی۔ انھوں نے دو ماہوار رسائل کا اِجرا کیا۔ ان میں سے ایک کا نام ''نظارہ'' تو مجھے یاد ہے، دوسرے کا پتا نہیں۔ ایک ہفت وار پرچے سے بھی منسلک رہے۔ اس کا نام ''خدمت'' تھا۔ رسائل کے اوّلین شمارے تو بڑی آب و تاب اور طمطراق سے نکلتے۔ ان پر اچھا خاصا پیسا بھی صرف کیا جاتا۔ مگر کاروباری میلان نہ ہونے کی وجہ سے یہ سلسلہ تادیر جاری نہ رہتا۔ تیس کی دہائی کے اوائل میں وہ ایک پرچے کے مدیر کی حیثیت سے لاہور تشریف لے گئے۔ مگر تین چار ماہ ہی میں گھر واپس آ گئے۔ یار لوگوں نے استفسار کیا تو کہا:

''میرے لاہور جانے کا مقصد علامہ اقبالؔ سے ملنا تھا کہ ان سے زندگی، مذہب اور ادب کے بارے میں گفتگو ہوسکے۔ مقصد پورا ہوگیا تو لاہور ٹھہرنے کا کوئی جواز نہ تھا۔''

اپنے پہلے شعری مجموعے ''متاعِ درد'' کے دیباچے میں عموجان نے صاف گوئی سے اعتراف کیا ہے کہ:

''میرا اُردو کا مطالعہ میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ تک محدود ہے۔ دوسروں کے مذاقِ شعری کے لیے نہ میرے پاس وقت تھا اور نہ خواہش۔''

مجموعے کا ایک نسخہ علامہ اقبالؔ کو بھیجا گیا۔ جوابی خط میں اقبالؔ نے ایک شعر کی بہت تعریف کی جو غالباً اُن کے شعری ذوق کے مطابق تھا۔

جان دیتا ہوں قفس میں دونوں پَر کھولے ہوئے
حسرتِ پرواز میں بھی شان ہے پرواز کی

جامعہ ملیہ کا یہ مختصر قیام بھی فوائد سے خالی نہیں تھا۔ اسی زمانے میں اُن کی دوستی ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر مجیب اور مولانا حسین حسان سے ہوئی جو بعد میں باہمی میل جول سے اور بھی پروان چڑھی۔ جامعہ کے اس دور کے ایک ہم عصر عبداللطیف جامعی آج بھی بقیدِ حیات ہیں اور تن دہی سے لکھنے پڑھنے میں لگے ہوئے ہیں۔

اپنی داستانِ حیات سنانے سے پہلے یہ باور کرانا مناسب سمجھتا ہوں کہ زندگی کا سفر یک جہت اور سپاٹ نہیں ہوتا۔ سو اس میں کڑا تاریخی تسلسل دکھانا محال ہے۔ کہیں کہیں اس سے انحراف کی ضرورت بھی پڑے گی۔

سرکاری ریکارڈ کے مطابق میری پیدائش ۱۲/مارچ ۱۹۳۲ء ہے۔ اس کا اندازہ تو تمھیں ہوگا کہ اس دور میں تاریخیں یاد رکھنے کا ویسا اہتمام نہیں ہوتا تھا جیسا کہ اب ہے۔ مغرب میں تو اُس دور میں بھی بلکہ اس سے کہیں پہلے تاریخی ریکارڈ کی درستی کا خیال رکھا جاتا تھا مگر ہمارے ہاں ایسی صورتِ حال نہ تھی۔ سو اپنی تاریخِ پیدائش کی درستی کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ قرآن شریف کے ایک نسخے او رایک مختصر بیاض میں جو حال ہی میں دریافت ہوئی ہے، خاندان کے بچوں کی تاریخِ پیدائش درج کی گئی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ نہ جانے کس وجہ سے ان اندراجات میں میرا نام کہیں موجود نہیں۔ تمھاری پھوپھی کی تاریخ پیدائش ۲۴/ اپریل ۱۹۳۱ء (۵/ ذی الحجہ ۱۳۴۶ھ) درج ہے۔ وہ مجھ سے چھوٹی تھیں۔ اس لحاظ سے میرا سنِ پیدائش ۱۹۳۰ء یا اس سے بھی پہلے کا ہو سکتا ہے کیوں کہ عمو جان کی شادی کی تاریخ ۲۷ دسمبر ۱۹۲۷ء (یکم رجب ۱۳۴۲ھ) ہے۔ ایک قابلِ ذکر بات

یہ ہے کہ تاریخ پیدائش کے اندراجات اسلامی اور عیسوی تقویم کے لحاظ سے الگ الگ کیے گئے ہیں۔

۱۲/مارچ ۱۹۳۲ء کی تاریخ اسکول میں داخلے کے وقت لکھوائی گئی تھی۔ اس زمانے میں ہمارے گھرانے میں چھٹی جماعت تک پڑھائی گھر پر ہی ہوتی اور بعدازاں اسکول کا رُخ کیا جاتا۔ اب جو بھی صاحب مجھے اسکول داخل کرانے لے گئے تھے اُنھوں نے اندازے سے ایک تاریخ لکھوادی۔ غالباً قدیر چچا نے پہلی بار اس غلطی کی نشان دہی کی۔ قدیر چچا سلسلہ نسب اور علم الاعداد کے ماہر تھے۔ انھوں نے پڑوس میں رہنے والی ایک بزرگ خاتون سے اپنی بات کی تصدیق بھی کی۔ خاتون کے مطابق میری پیدائش کسی تہوار کے دنوں میں ہوئی تھی۔ قدیر چچا ایک چلتی پھرتی قاموس تھے۔ ان کے پاس ایک وسیع ذخیرۂ کتب تھا جو اُن کی اولاد نے ردّی کے طور پر بیچ کھایا ہوگا۔

میں اپنی دادی اور والدہ کے بارے میں تفصیلاً ایک مضمون ''کیا لوگ تھے ہم سے پہلے'' میں لکھ چکا ہوں جو سہ ماہی ''سیپ'' کراچی میں شائع ہوا۔ باجی انتہائی دریا دل خاتون تھیں۔ وہ ضرورت مندوں کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتی تھیں۔ اس کے لیے اُنھیں اپنی یا ہماری ضروریات کو محدود بھی کرنا پڑتا تو بھی کوئی عار نہ ہوتا۔ مجھے یاد ہے کہ دورانِ وضو کوئی مانگنے والی آجاتی تو کانوں کی نقری بالیاں اُتار کر دے دیتیں۔ نہ تو وضو نامکمل چھوڑنا منظور تھا اور نہ سائلہ کو انتظار کروانا۔

دوسری جنگِ عظیم جاری تھی۔ مردانہ خانے میں بہت سے افراد قیام پذیر تھے۔ کان پور کے قرب و جوار سے آئے ہوئے یہ لوگ روز گار کی تلاش میں تھے کہ جنگ کی وجہ سے کان پو رکی آرڈیننس فیکٹری میں کارکنوں کی کھپت معمول سے زیادہ تھی۔ بعض اوقات ان لوگوں کی تعداد خاصی زیادہ ہوجاتی۔ ان سب کا صبح کا ناشتا اور رات کا کھانا ہمارے ہاں ہی ہوتا تھا۔ کچھ لوگ دوپہر کے کھانے میں بھی شریک ہوجاتے۔ یہ سب انتظام باجی کے ذمے تھا۔ کھانا گو کہ سادہ ہوتا، یعنی روٹی سالن یا دال چاول لیکن اتنے آدمیوں کا بندوبست کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اُن دنوں بامعاوضہ مہمان (Paying guest) کا کوئی تصور نہ تھا۔ کچھ لوگ تو ہمارے رشتے دار تھے اور باقی کسی نہ کسی جاننے والے کے توسط سے ہمارے گھر ٹھہرے ہوئے تھے۔ لوگ آتے تو تھے مختصر قیام کے لیے لیکن عموماً یہ قیام خاصا طویل ہو جاتا۔ کچھ مہمان تو ہمارے نام پر اُدھار بھی لے لیتے جو وہ کبھی ادا نہ کرتے۔ ایک صاحب نے جو اپنے حلیے اور طرزِ بود و باش سے خاصے معزز نظر آتے تھے، پے درپے اُدھار کرکے خاصی رقم واجب الادا کر لی۔ اُن کی سمجھ داری کا یہی تقاضا تھا کہ وہ چپکے سے رفو چکر ہوجاتے ۔ سو وہ خاصے سمجھ دار نکلے۔

جنگ کے دوران مہنگائی اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی۔ ایسی گرانی اور کسادبازاری اس سے پہلے نہ دیکھی نہ سنی۔ اشیا کی قیمتیں ہرروز بڑھتی جارہی تھیں۔ آج کے بچوں کو تو یہ سن کر ہنسی آئے گی کہ مہنگائی کی وجہ سے آٹا روپے کا آٹھ سیر ہوگیا تھا، مگر حقیقت یہ ہے کہ ان دنوں تھوڑے پیسوں کا حصول بھی بہت مشکل تھا۔ جنگ کے اثرات کے باعث نت نئی ملازمتوں کے وسیلے پیدا ہوتے رہتے لیکن ہمارے خاندان میں ان سے فائدہ اُٹھانے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ مذہبی اور روایت پسند گھرانوں میں انگریز کی ملازمت کو اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ نتیجتاً خاندان کے چند ہی افراد نے ملازمتیں اختیار کیں۔ ان میں ایک تو پھوپھی زاد بھائی سیّد محمد احمد تھے اور دوسرے سیّد محمد مسلم جو بڑے چچا کے بیٹے تھے۔

ہمارے محلے میں فوج کے استعمال کے لیے چمڑے کی مصنوعات، فولادی چٹکیاں اور کیلیں وغیرہ تیار ہونے لگیں۔ اس سے اہلِ محلّہ کی اوسط آمدنی پر خاصا مثبت اثر پڑا۔ ہمارے خاندان میں چونکہ کاروبار کا رواج نہیں تھا، سو کسی بھی قسم کے فائدے کی اُمید رکھنا عبث تھا۔ مجموعی آمدنی ایک طرح سے رُوبہ تنزل تھی کہ افراطِ زر کے شکار کرایہ دار اس قابل نہیں تھے کہ اُن سے بڑھا ہوا کرایہ وصول کیا جاتا۔ خاندانی وقار، گھر میں ٹھہرے مہمانوں سے کھانے وغیرہ کے مصارف لینے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ ہاں، کچھ لوگ خود خیال رکھتے تھے۔ ایک صاحب تھے جناب امتیاز، ان کا تعلق فتح پور سے تھا۔ وہ کبھی کبھار پھل یا مٹھائی لے آتے۔ ایک اور صاحب جناب لطیف اثر اکثر کھانے پینے کی اشیا اور بچوں کے لیے کھلونے وغیرہ لے آتے۔ آثر شاعری میں والد صاحب کے شاگرد تھے۔ کچھ عرصہ پہلے اُن کا انتقال ہوا۔ ان کے آخری دن تھے۔ میں ان سے ملا تو عموجان کو یاد کرکے رو دیے۔

ان ہی دنوں کی بات ہے۔ عید کا موقع تھا۔ پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ میرا عید کا جوڑا نہ بن سکا۔ باجی نے اپنا ایک بہترین جوڑا نکالا اور اس کو کاٹ پیٹ کر میرا کرتا سی دیا۔ چاند رات کو اُنھوں نے مجھے گلے لگایا اور صبح پہننے کے لیے وہ کُرتا دیا۔ اس بات کو اب نصف صدی سے زیادہ عرصہ ہو چلا ہے۔ ممتا کی خوشبو سے معطر ہلکے دھانی رنگ کا وہ کُرتا آج بھی میرے حافظے میں محفوظ ہے۔ بعد میں اللہ کے فضل و کرم سے بیش قیمت ملبوسات پہننے کی توفیق ہوئی لیکن اماں کے ہاتھ کا سلا ہوا وہ کرتا میرے لیے سب سے زیادہ قیمتی ہے۔

میں باجی کے دوجوڑے پاکستان لایا تھا۔ ان میں سے ایک کرتے کی کترہیونت کرکے طاہرہ نے تمھارا پہلا لباس سیا۔ دوسرا ابھی تک ہمارے پاس ہے جو کہ گزرتے وقت کے ساتھ اتنا خستہ ہوگیا

ہے کہ اسے ہاتھ لگاتے ڈر لگتا ہے۔ ایک عرصے تک رواج یہ تھا کہ خاندان کے کسی نیک طینت بزرگ کی اُترن سے نومولود کا پہلا لباس بنایا جاتا۔ اس کو جذباتی بات کہہ لو یا مابعدالطبیعیاتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمھارے کردار کی اُٹھان میں اس لباس کا بھی حصہ ہے۔

باجی میری پہلی معلّمہ تھیں۔ میں نے اوّلین اسباق اُنھی سے لیے۔ نمازِ فجر کے بعد دن کا آغاز ہوتا۔ ناشتا کیا جاتا اور اس کے بعد دوپہر کے کھانے کی تیاری شروع ہوجاتی۔ باجی باورچی خانہ سنبھالتیں اور میں ان کے ساتھ بیٹھا با آوازِ بلند قرآن پڑھتا جاتا۔ بعض اوقات یہ سلسلہ تین گھنٹوں سے بھی تجاوز کرجاتا اور بے کلی محسوس ہونے لگتی۔ کچھ بڑا ہوا تو اُردو کے اسباق شروع ہوگئے۔ اردو کی پہلی کتاب کی مصنف تھے مولانا اسمٰعیل میرٹھی..... مولانا کی شہرت کا سبب اُن کی بچوں کی کتابیں (Readers) ہیں جن کی تعداد آٹھ ہے۔ بچوں کے لیے اُن سے بہتر نثر اور نظم کوئی اور نہ لکھ سکا۔ اُردو کی یہ کتاب زبان کے قواعد سے آشنا کرنے والی کتاب ہی نہیں تھی بلکہ اس کا بنیادی مقصد بچوں میں پڑھنے کا شوق پیدا کرنا تھا۔ لہٰذا اُردو پڑھنے کے ساتھ ساتھ ہم دیگر علوم مثلاً تاریخ، جغرافیہ، معاشرت اور زراعت وغیرہ سے بھی روشناس ہوجاتے۔ زراعت چونکہ ہندوستانی معاشرے کی بنیاد تھی، بچوں کو مختلف موسموں اور ان میں بوئی اور کاٹی جانے والے فصلوں کے بارے میں بتایا جاتا۔ بنیادی تعلیم کے بعد جب پڑھنے کے قابل ہوا تو آٹھ کی آٹھ کتابیں کسی کے پڑھائے بغیر خود ہی پڑھ گیا۔اگر کہیں کوئی دشواری ہوتی تو کسی بڑے سے پوچھ لیتا۔ آج کل کے بچے اپنے وزن سے زیادہ وزنی کتابیں ڈھوتے نظر آتے ہیں۔ مولوی اسمٰعیل کی کتابوں کو سامنے رکھتے ہوئے، ابتدائی جماعتوں میں صرف زبانیں پڑھائی جائیں تو بچوں کو بار برداری اور مختلف النوع مضامین کی پڑھائی کے دباؤ سے نجات مل جائے۔

اُردو کے علاوہ مجھے ریاضی پڑھائی گئی۔تم نے اپنے چچا ابوالحسنات کی بیٹھک دیکھی ہوگی۔ یہ کمرہ دراصل مولانا سعید رزمی کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔ مولانا حلیم مسلم کالج میں اُردو اور فارسی کے استاد تھے۔ مولانا ہمارے ہاں کیسے آئے.....؟ یہ ایک دلچسپ داستان ہے۔ عمو جان نے ایک دن نکھٹو شاہ کی مسجد میں ایک نوجوان کو دیکھا جو ایک کبوتر ذبح کر کے عجیب و غریب طریقے سے اس کے پر نوچ رہا تھا۔ نام وغیرہ پوچھا تو معلوم ہوا کہ مشرقی یوپی کے ایک مدرسے کے تازہ فارغ التحصیل ہیں۔ اور اب مولوی بننے کے لیے کان پور تشریف لائے ہیں۔ ان سے فارسی اور عربی میں گفتگو کی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ موصوف خاصے ذہین واقع ہوئے ہیں۔ فوراً ہی اُن کو اپنے گھر ٹھہرنے کی دعوت دے ڈالی۔ یہ نوجوان مولانا رزمی تھے جو جلد ہی ہمارے گھر کے ایک فرد بن گئے۔ میں نے اور بہن حمیرا

نے ان سے اسباق لینے شروع کر دیے۔ رشتے کے چند بہن بھائی بھی اس پڑھائی میں ہمارے شریک ہوگئے۔ میں تو پڑھتا رہا مگر دوسرے طالبانِ علم جلد ہی انگریزی اسکولوں کو سدھارے۔ مولانا کا پڑھانا میرے حق میں بہت مفید ثابت ہوا۔ ایک ہی سال میں فارسی میں اس حد تک رواں ہوگیا تھا کہ جلسوں میں فی البدیہہ تقریر کرلیتا۔ ان کی مستقل شاگردی میں رہ کر ''سیرۃ النبی ﷺ'' پڑھنے کا شوق ہوا اور دینی و عمومی تعلیم کے دروازے مجھ پر وا ہوتے گئے۔ میں بہ مشکل آٹھ، نو سال کا تھا، وہ لوگ جنھوں نے مجھے اس عمر میں جلسوں سے خطاب کرتے سنا، آج بھی موجود ہیں۔

اُن ہی دنوں ایک عرب معلم ہمارے ہاں رہائش پذیر ہوئے۔ یہ وقت اُن کی فراغت کا تھا اور ابھی حج کا موسم شروع ہونے میں خاصے دن تھے۔ بعض عرب معلم مستقل طور پر ہمارے شہروں میں رہتے تھے۔ ان ہی معلّمین میں سے کچھ زیادہ متمول تھے۔ جیسے لکھنؤ کے عبدالرزاق سکندر، سو ان کے پاس اپنے دفاتر تھے۔ جو بے چارے خستہ حال تھے وہ چھوٹے قصبات اور محلوں میں رہنے پر مجبور تھے۔ ۱۹۴۰ء کے لگ بھگ کی بات ہے۔ ایک عرب معلم ہمارے محلے میں تشریف لائے۔ جلد ہی سب کو اندازہ ہوگیا کہ یہ ذرا مختلف قسم کے انسان ہیں۔ موصوف نے اپنا وطن چھوڑا، اپنے پیشے کو خیر باد کہا اور ہندوستان میں آبسے۔ اپنی گزر اوقات کے لیے کوئی بھی چھوٹا موٹا کام کرلیتے۔ ہم نے انھیں عرب صاحب کہنا شروع کردیا۔ وہ دن بھر عربی قہوہ بنا بنا کر خود بھی پیتے اور ہمیں بھی پلاتے۔ کچھ دنوں بعد ہم اس قہوے کے اتنے ہی عادی ہوچکے تھے کہ جتنے خود عرب صاحب تھے۔ عمو جان ان سے عربی میں گفتگو کرتے۔ صدیوں سے رائج ہمارے درسِ نظامیہ کے سلسلے کے باوجود، بلکہ شاید اسی کی وجہ سے ہمارے بیشتر مذہبی علماء رواں عربی بولنے سے قاصر ہیں۔ عام بول چال کی زبان کو تو سمجھ بھی نہیں پاتے۔ عموجان عام بول چال کی عربی بخوبی بول لیتے تھے۔ میں نے عرب صاحب سے عربی سیکھنی شروع کی۔ اس تعلیم کا فائدہ بعد میں اسکول اور کالج میں ہوا جہاں عربی اختیاری مضمون تھا۔

عرب صاحب ریگستانی علاقے سے تشریف لائے تھے۔ اس کے باوجود ہندوستان کی گرمی اُن سے برداشت نہ ہوتی۔ وہ کھری چارپائی پر لیٹ جاتے اور حدی خوانوں کی طرح یا نینی تال، یا شملہ کا نغمہ گاتے۔ موصوف مسلم لیگ کے حامی بن گئے اور تحریکِ پیغام کی نشر و اشاعت کے لیے مسجدوں میں جانے لگے۔ وہ بعدِ نمازِ جمعہ اپنی ٹوٹی پھوٹی اُردو میں حاضرین سے خطاب فرماتے۔ اس خطاب میں قرآن کی آیتوں کا ترجمہ بھی پیش کیا جاتا۔ ترجمہ اور تشریح جس انداز میں کی جاتی وہ کچھ ان ہی کا حصہ تھا۔ خود ساختہ فلسفیانہ خیالات بھی پیش فرماتے۔

''جناح کی داڑھی (کے نہ ہونے) کو نہ دیکھو۔ رسول ﷺ نے فرمایا۔ اللہ تمھارا لباس اور شکل نہیں دیکھتا وہ تو تمھارا دل دیکھتا ہے۔''

ان کا انداز ملاحظہ فرمایئے:

''تم ہندو کو چھورو، کلمے کو پکرو، کلمہ تم کو اسلام دیا۔ کلمہ تم کو بی بی دیا۔ کلمہ تم کو بچہ دیا۔''

عرب صاحب کی سیاسی سرگرمیاں بڑھ گئیں۔ وہ کانگریسی مولویوں کے زیر انتظام مساجد میں بھی مسلم لیگ کا پرچار کرتے۔

''اے ایمان والو.....! مسلم لیگ کو پکرو.....''

اس کا جو نتیجہ نکلنا تھا اس کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ انگریزی سرکار نے عرب صاحب کو اُن کی سرگرمیوں کے باعث دیس نکالا دے دیا۔

۱۹۴۰ء کے موسم گرما میں، میں نے تقریباً دو ماہ تک انگریزی پڑھی۔ میرے استاد تھے جناب لطیف اثر اور جناب عبدالستار ۔ عبدالستار صاحب آج کل کراچی میں وکالت کے پیشے سے منسلک ہیں۔ دس برس بعد حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ عبدالستار صاحب میرے شاگرد ہوگئے۔ وہ کان پور میں میٹرک تک تعلیم حاصل کرسکے تھے۔ کراچی آکر انھیں اپنی تعلیم مکمل کرنے کا خیال آیا۔ اُن کی اُردو اور انگریزی کی استعداد قابلِ رشک تھی۔ لوگ اُنھیں گریجویٹ سمجھتے۔ اسی بنا پر وہ کالج میں داخلہ لینے سے ہچکچاتے رہے۔

میں اپنے ذاتی تجربے سے یہ بات وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر انسان اپنی مادری زبان کے علاوہ کوئی دوسری زبان بھی سیکھتا ہے تو پھر تیسری اور چوتھی زبانیں سیکھنا اس کے لیے مشکل نہیں رہتا۔ میں نے انگریزی زبان غیر رسمی طریقے سے سیکھی۔ میں رواں لب و لہجے کے ساتھ اس طرح تو انگریزی نہیں بول سکتا جیسے ''انگریزی میڈیم'' درس گاہوں سے فارغ التحصیل افراد بولتے ہیں لیکن زبان پر مجموعی استعداد بہت سوں سے بہتر ہے۔ زبان سے ناواقفیت ہمارے گرتے ہوئے تعلیمی معیار کا شاخسانہ ہے۔ یہ ایک قومی المیہ ہے۔ انگریزی تو دور کی بات ہے، ہم ٹھیک سے اُردو بھی نہیں جانتے۔ ایک مرتبہ میں نے ایم اے (اُردو) کے طلبہ کو جانچا تو یہ جان کر دُکھ ہوا کہ اُن میں سے بیشتر یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ ''قافیہ'' کیا ہوتا ہے۔

☆☆☆☆☆